طویل نظم اور اقبالؔ

ڈاکٹر عابد خورشید

Allama Iqbal`s poetry is remarkably insightful and no one matches his poetic caliber. The contribution of Iqbal in the long poems is that he not only upheld its characteristics but also played a great part in the completion of such writings. The process of the subject matter of his long poems is remarkable. Representation of characteristics of his long poems like sensation, emotions and diction give a touch of not only maturity but also that of perfection. The standards he set for the representation of self are artistically brilliant and elegiac in temper. The long poems of Iqbal are replete with a sensational affiliation with his love for country which can be said to be a turning point in the field of such kinds of practices through poetry.

اقبالؔ کی عطا یہ ہے کہ اُنھوں نے طویل نظم کی صنف کو اُس کے مروجہ محاسن سے تکمیلی ابلاغ کے قریب تر کیا، اُن کی طویل نظموں میں موضوع کی امتزاجی حیثیت اور اُس کا پھیلاؤ بہت توانا ہے، پھر احساس کی لہر، جذبے کا فشار، انتخابِ الفاظ، ایسے اوصاف ہیں جن کی مدد سے یہ کہنا مشکل نہیں کہ اقبالؔ نے طویل نظم کو ایسا وسعت آشنا کیا کہ اِس صنف میں پختگی اور آراستگی در آئی۔

یوں تو اقبالؔ کی طویل نظمیں وسیع امکانات کی حامل ہیں اور چند ایک نظموں کے تخلیقی فشار میں اِتنی شدت ہے کہ جن میں اُس کے عقب کی حسی قوت Frequency ڈایا میٹر کی سوئی کی طرح بار بار اپنے حصار سے باہر نکلنے کی سرتوڑ کوشش کرتی ہے۔ تحلیل، تجزیے اور تصورات کے مابہ الامتیاز، شاعر کی حیثیت اُس پتنگے کی طرح ہوتی ہے جسے شمع کے شعلے کو مس کر کے واپس آنا ہوتا ہے اور اپنے 'تجربے' سے دوسروں کو آگاہی دینا ہے۔ علاوہ بریں موضوع میں variation یا امتزاج کے علاوہ اقبالؔ کی یہ عطا کیا کم ہے کہ اُنھوں نے اپنی طویل نظموں میں بالخصوص مفرد لفظ کو اصطلاح کا معیار عطا کر دیا ہے۔ 'خودی، صحرا، عشق، بے خودی، شمع، شاعر، پروانہ، پتنگا، شاہین، لالہ، جگنو' ایسے لاتعداد الفاظ ہیں، جنھیں اصطلاحی روپ

دے کر اُمر کر دیا ہے۔ اقبال کی طویل نظموں میں یہ افسوں پذیری جن جہتوں میں آشکار ہوتی ہے :

شکوہ

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دِل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق ، گئے وعدۂ فردا لے کر — اَب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر[۱]

علامہ محمد اقبال (۹ نومبر ۱۸۷۷ء-۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء) کی شہرۂ آفاق طویل نظم 'شکوہ' اُن کے شعری مجموعہ'' بانگ درا'' میں شامل ہے۔ زیرِ نظر متن، اُن کی کلیات سے لیا گیا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ 'شکوہ اپنے سے کیا جاتا ہے،اور پھر یہ شکوہ جو بندے کا اپنے رب سے ہے،ایسا پُر شکوہ اسلوب کم از کم اُردو شاعری میں عنقا ہے، اِس انداز اور اسلوب کی اُٹھان ہی الگ ہے۔ مرتبے اور مقام کا لحاظ بھی ملحوظِ خاطر ہے اور اقبال کی بلند حوصلگی بھی دیدنی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی یہ رائے ملاحظہ کیجئے ،تا کہ اِس نظم کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکے کہ یہ نظم نہ صرف اقبال کے شعری مقام کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے بلکہ اُردو شاعری بھی، ایسی نادرالمثل تخلیق سے نابلد تھی، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> اقبال کی طویل نظموں میں ''شکوہ'' ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ پہلی طویل نظم ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے دورِ عظمت و شوکت اور اُن کی موجودہ زبوں حالی کو ایک نہایت فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انداز شکوہ کا ہے اور شکوہ بھی اللہ سے۔ اُردو کا شعری سرمایہ اِس انداز سے بالکل ناآشنا تھا۔[۲]

دورانِ قرات نظم میں لہجے کا تنوع اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتا ہے، محض نظم کو پڑھنے سے ہی یہ کیفیت آشکار ہو جاتی ہے کہ اِسے پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے بعد ذہنی رسائی میں تبدیلی آ چکی ہے۔ ''شکوہ'' کرنے کے پیمانے (parameters) ہی وہ نہیں رہتے جو دستور العمل ہیں۔ اِس نظم کی واردات ایسی ہے کہ دورانِ قرأت یوں محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والے پر اِس کا نزول ہو رہا ہے۔ داخلی اور خارجی مظاہر کو یکساں طور پر نظم نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔

عمرانی حوالے سے دیکھیں تو انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں مسلمان جس ذہنی کشمکش سے گزر رہے تھے، اُس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی واحد سیاسی قوت سلطنت عثمانیہ لخت لخت ہو چکی تھی، مسلمان ہر طرح کے ذہنی و فکری خلفشار کا شکار ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں تو غلامی کا طوق تھا ہی، عالمی سطح پر جو تھوڑی بہت شنوائی مسلمانوں کی رہ گئی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ ایسے میں ہر اُمید کی معدومیت اپنے اختتام کی جانب تیزی سے بڑھ رہی تھی ، اِن حالات میں اقبال نے ''شکوہ'' کے ذریعے صرف اُمید نہیں دلائی بلکہ اُمید کی اُنگلی پکڑ اُسے یقین کے سپرد کیا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر 'شکوہ' کی معنوی توسیع کرتے ہوئے پرت در پرت کھولتے ہوئے، اس کے ایک اور

منفرد اور اچھوتے پہلو کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

> اقبال نے ''شکوہ'' میں جس طرح خدا سے خطاب کیا، یہ اُردو شاعری میں ایک نئی آواز ہی نہیں بلکہ انسان اور خدا کے تعلقات میں نئی جہت بھی ہے۔ اب تک اُردو شاعری میں خدا سے خطاب کے انداز میں خاصی یکسانیت ملتی تھی۔ اگر ایک انتہا پر حمد و ثنا تھی تو دوسری پر رندانہ شوخی کے زیر اثر کافرانہ انداز..........۔[۳]

اِس نظم کے ۳۱ بند ہیں۔ بحر، رمل مثمن مخبون مقطوع ہے اور ارکان فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن پر مشتمل ہیں۔ یہ طویل نظم جس میں ماضی کی پُرعظمت روایات کو متنوع الجہات امکانی حربوں سے بیان کیا گیا ہے، اِس میں تلمیحات کا سہارا بھی فطری ہے لیکن ایجاز و بلاغت کی ایسی فضا تخلیق کی ہے کہ نہ صرف محاسن شعری کو بے رس نہیں ہونے دیا بلکہ غنایہ کے تشخص کو بھی زائل ہونے سے بچا لیا۔ شکوہ عام طور پر مایوسی کے عالم میں کیا جاتا ہے، لیکن اقبال کے' شکوہ' میں یاست نہیں، اُنھوں نے اِس کے معانی ہی بدل دیے۔ اُمت کے اِس مرثیے میں وارداتِ شعری کو وہ بیانیہ کی سطح پر نہیں لائے۔

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :

> اقبال نے ''شکوہ'' کے دونوں انداز روا رکھے ہیں۔ یعنی پہلے تو محبوب کو اپنی وفاداری کا احساس دلایا اور پھر غیروں پر اُس کی نوازشات گنوانے کی صورت میں طعنہ زنی کی۔[۴]

لطف مرنے میں ہے باقی ، نہ مزا جینے میں
کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں
کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اِس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں[۵]

اِس بلیغ الفکر اور بصیرت افروز نظم سے اثر پذیری اور اثر انگیزی دونوں طرح کے اثرات پڑھنے والے پر مرتسم ہوتے ہیں اور وہ نظم کے مصرعوں کے بطون میں اُس احساس کو کریدنے لگتا ہے جو اُس کے اندر کنڈلی مار کے بیٹھا ہے، جسے باہر لانے میں وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ اقبال اُس میں وہ قوت بھرتے ہیں کہ وہ اظہار کے رستے کی رکاوٹیں مسمار کر دیتا ہے۔ رُخسانہ شاہین رُخی اپنے ایم فِل کے مقالہ ''اقبال کی طویل اُردو نظموں پر لکھی گئی کتب کا جائزہ'' میں لکھتی ہیں :

> شکوہ، اقبال کی بلند فکری کا نتیجہ ہے، اور اُن کی ذہنی بیداری کا نمایاں ثبوت ہے۔ نہ صرف مسلمانوں کو تحرک، بلندی، منزل کے تعین کا احساس دلایا بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کی سوچ پر بھی کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔[۶]

فی الاصل یہ نظم جذباتی لگاؤ کی تفسیرِ محض سے زیادہ کشفِ اقدار کی غماض ہے، جس میں سوز و گداز کا میلان جذب و کیف کے عناصر کو ایک مرکزی نکتے پر مرتسم کرتا ہے، جسے اقبال کے کثیر الجہتی شعور اور مرتعش حسیت سے منسلک کر کے نظم کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

❁❁❁

شمع اور شاعر

شمعِ محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا		تیرے پروانے بھی اِس لذت سے بیگانے رہے
رشتۂ اُلفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا		پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے؟
شوقِ بے پروا گیا ، فکرِ فلک پیما گیا		تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے [۷]

علامہ محمد اقبال کی طویل نظم 'شمع اور شاعر' اُن کے شعری مجموعے ''بانگ درا'' میں شامل ہے اور زیرِ نظر متن اُن کی کلیات سے لیا گیا ہے۔ اِس نظم کے عنوان میں جو دو عناصر موجود ہیں، اُن کے مشترکہ تلازمات میں 'روشنی' اور 'پگھلنا' بنیادی اختصاصات کے متقاضی ہیں نیز اِن کا مکالمہ فکر و فلسفے کی متعدد جہتیں سامنے لاتا ہے۔ یہ نظم فروری ۱۹۱۲ء میں تخلیق ہوئی اور انجمن حمایت اسلام کے ۲۷ویں اجلاس میں پڑھی گئی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کے کچھ اجلاس صرف اقبال کی نظموں کو سننے کے لیے ہی منعقد کیے جاتے تھے، باقی کی کارروائی رسماً ہی دِکھائی دیتی ہے۔لیکن اِن اجلاسوں میں شریک ہونے والے افراد اپنے ساتھ اقبال کی فکر اور اُن کا رجائی نقطہ نظر ساتھ لے کر جاتے جس سے اُن کی ذہنی استعداد اور بیدار مغزی میں اضافہ ہوتا اور اُن کی سطوتِ رفتار بھی بڑھ جاتی۔

یہ نظم ترکیب بند ہیئت کے گیارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ بحر، رمل مثمن محذوف الآخر میں ہے جس کے ارکان فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فاعلن پر مشتمل ہیں۔نظم کے ابتدائی اشعار فارسی میں ہیں۔نظم کا تخاطب چونکہ صرف ہندوستان میں بسنے والے مسلمان نہیں تھے ، اِن فارسی اشعار کی یہ توجیہ بھی دی جا سکتی ہے۔نظم کا انداز رزمیہ اور علامتی ہے۔ 'شمع' اور 'شاعر' دونوں ہی علامتی کردار ہیں۔

زود حسی اور جذباتیت، ایک حقیقت نگار کے لیے فطری تقاضے ہیں لیکن اقبال محض حقیقت نگار نہیں بلکہ فطرت نگار بھی تھے۔اُن کی مقصدیت ظاہری اظہار تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ باطنی خواصی کے داعی بھی تھے، اِسی لیے اُن کے ہاں موجِ مضطر بھی ہے اور آتش نوائی کا واضح میلان بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے :

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش		اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اِس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار		نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک		بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی [۸]

اسلوب احمد انصاری اپنے مضمون ''اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر'' میں اِس نظم کے بطون میں غواصی کرتے ہوئے شمع اور شاعر کے کرداروں کے علامتی پیرایوں کو یک جائی کا عنصر قرار دیتے ہیں اور اجمالی نقطۂ نظر سے احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں :

> شمع اور شاعر میں شمع کا استفسار مختصر سا ہے البتہ شاعر کے کردار کو ایک معمول کے کام میں لا کر اقبال نے اُن بہت سے تجربات اور احساسات کو متشکل کیا ہے جو اُن کے دل کی گہرائیوں میں ہنگامہ پرور تھے۔[۹]

نظم 'شمع اور شاعر' تکثیریت کی زائیدہ قوتوں کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اقبال نے جہاں معاشرے کے انحطاط کے عوامل گنوائے ہیں، وہیں جبریت، استبداد، احساس ہزیمت اور عدم توافق کو فطری آزادی سے متضاد قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے اِس طویل نظم میں کئی ایک شعری محاسن ہنرمندی سے برتے ہیں جن میں صنعت تفریق ''گریہ ساماں۔طوفانِ اشک'' وغیرہ صنعت جمع ''دانہ،کھیتی،باراں اور حاصل بھی تو'' وغیرہ،صنعت اشتقاق ''راہ، راہ رو، رہبر، منزل بھی تو'' کے علاوہ اور بہت سے شعری محاسنات کا استعمال دیکھا کیا جا سکتا ہے۔

❁❁❁

مسجد قرطبہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اِس کے دِنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند ، اس کا خیال عظیم　　اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں ، کار کشا ، کارساز[۱۰]

علامہ محمد اقبال کی طویل نظم 'مسجد قرطبہ' اُن کے شعری مجموعے ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے اور زیرِ نظر اشعار اُن کی کلیات سے لیے گئے ہیں۔نظم پیکر جمال اور پیکر جلال کا حسیں مرقع ہے اور اِن دونوں مظاہر کی جملہ خصوصیات کشفی صورت میں پائی جاتی ہیں۔اِس نظم کو اقبال کا 'شعری مرکزہ' بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔زمانی بُعد کو ایک تسلسل سے مربوط کرتی ہوئی یہ نظم ماضی ، حال اور مستقبل ، تینوں زمانوں کے نقطۂ ارتکاز پر ایستادہ ہے۔عمیق حنفی اِسے 'نقطۂ امروز' بھی کہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> اقبال کا مزاج لمحۂ حال کی اسیری قبول کرنا پسند نہیں کرتا، اِس نظم میں بھی وہ نقطۂ امروز کی کشتی پر سوار ہو کر دوش و فردا کی طویل سیاحت کے لیے نکل پڑے۔[۱۱]

جیسے بادلوں سے ٹکرانے سے بجلی کی گرج پیدا ہوتی ہے، اِس طویل نظم کے مصرعوں کی تقسیم ایسی ہے کہ اُنھیں ملانے سے مخصوص چمک پیدا ہوتی ہے اور پڑھنے والا ہر بار اِس کی چکا چوند سے مسحور ہو جاتا ہے۔

یہ نظم ۱۹۳۳ء میں اقبال کو عطا ہوئی یعنی اُن کے تخلیقی جہان کی تکمیل اور قربت میں یہ تخلیقی شہکار منصۂ شہود میں آیا۔اِس نظم میں صوتی آہنگ پر بہت سے ناقدین نے قلم اُٹھایا ہے۔یہ تکرار محرابوں کی بازگشت کے مماثل ہے، جس میں ورد کی کیفیت بھی از خود جنم لے لیتی ہے۔اِس تکرار میں خاص طرح کی نغمگی پائی

جاتی ہے، نیز نظم کی بُنت میں قوافی کا برجستہ استعمال بھی خوب ہے۔''مسجد قرطبہ'' پُرشکوہ عمارت کی داستان کے بعد جب حالت زار کا نقشہ کھینچنے پر پہنچتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اوائل میں مسجد قرطبہ بھی اُمت مسلمہ کی طرح نگینوں سے جڑی ہوئی تھی لیکن آخر اِس پر کیسے کیسے حاشیے بنا دیئے گئے :

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اُٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی روحِ امم کی حیات کشمکش انقلاب[۱۲]

''مسجد قرطبہ'' ترکیب بند کی ہیئت کے آٹھ بندوں پر مشتمل ہے، ہر بند میں اشعار کی تعداد برابر ہے ،اگر یہ کہا جائے کہ اِس نظم کا شمار اُردو کی سب سے زیادہ زیر بحث آنے والی طویل نظموں میں ہوتا ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اِس نظم میں خود اقبال کا نظریۂ تخلیق بھی پنہاں ہے، جس کی تطہیر نظم کے مصرعوں میں اُبھری تفہیم کی زائیدہ ہے۔ اِس نادر النظیر فن پارے پر کتابیں لکھی گئیں تو وہاں کلیم الدین احمد نے اِس نظم کو منتشر خیالات نظموں کا مجموعہ اور اسے شاعر کی فنی ہوش مندی کا شاخسانہ قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب، نظم کے باطنی اور ظاہری تنظیمی اَسرار کو سرسری طور پر ہی دیکھ سکے، چنانچہ اُنھوں نے لکھا :

> آپ [نظم کے] پہلے دو بندوں کو حذف کر دیں اور آخری بند کو بھی اور صرف بیچ کے پانچ بندوں کو پڑھیں تو آپ کو کسی خلا کا احساس نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ دوسری نظموں کی طرح اِس نظم میں بھی تکمیل کی کمی ہے اور بندوں کی ترتیب اٹل نہیں اور اِن میں تسلسل بھی نہیں۔[۱۳]

کلیم الدین احمد کے اِن نظریات کو پذیرائی نصیب نہ ہو سکی اور یہ نظم اپنے فکری حصار کو وسعت آشنا کرتی ہوئی آج بے مثل مقام و دائمی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے اِس نظم پر لکھے جانے والے اعلیٰ مضامین منتخب کر کے 'مسجد قرطبہ' کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی اُسے پڑھنے کے بعد یہ حقیقت مزید پختہ ہو جاتی ہے۔

❁❁❁

والدہ مرحومہ کی یاد میں

موجِ دودِ آہ سے آئینہ ہے روشن مرا گنجِ آب آورد سے معمور ہے دامن مرا
حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا رُخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا[۱۴]

علامہ محمد اقبالؔ کی طویل نظم 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اُن کے شعری مجموعے ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔ مذکورہ اشعار اُن کی کلیات سے لیے گئے ہیں۔ یہ نظم اپنے موضوع کی تفسیر ہے یعنی اپنی والدہ کے انتقال پر اقبالؔ نے اُن کا مرثیہ لکھا۔ نظم بحر، رمل مثمن محذوف الآخر میں ہے اور اِس کے ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ہیں۔

طویل نظم میں اگر موضوع کا تنوع ،ارتکاز دیکھنا مقصود ہو تو 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' اِس کی بہترین مثال ہے کہ اقبالؔ نے کس طرح اپنے ذاتی غم کو آفاقی غم میں متبدل کر دیا۔ ماں اور اولاد کا رشتہ بڑے ہی نازک ریشوں سے بندھا ہوتا ہے، نازک اِن معنوں میں کہ انسان جتنی بھی خواہش کر لے آخر کو سانس اور جسم کے اِس تعلق کو ٹوٹنا تو ہوتا ہے لیکن اِس مرحلے پر ضبط کے سارے بندھن اپنی حدیں از خود مسمار کر دیتے ہیں اور اقبالؔ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اسلوب احمد انصاری نے اِس کیفیت کو مراجعت کا نام دیا ہے ،وہ لکھتے ہیں :

> ماضی کی طرف یہ غیر شعوری مراجعت (regression) یادوں کے دُھندلے نقوش کو جلا بخشتی اور حال کی اس بے پناہ گرفت کو ڈھیلا کر دیتی ہے جو نشوو ارتقا کے لازمی قانون کی وجہ سے ہمیں اپنے اندر اسیر کیے ہوئے ہے۔ اس عمل کے دوران میں ہم اپنی موجودہ حیثیت کی مقتضیات کو بھول کر بے ساختگی کے ساتھ معصومیت کے دورِ اول میں پہنچ جاتے ہیں۔ [۱۵]

تاہم جونہی اُس لمحہ کے بوجھ میں ارتعاش جنم لیتا ہے تو اقبالؔ کی کیفیات یوں ظاہر ہوتی ہیں :

آہ ! غافل! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقشِ ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بے دردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ [۱۶]

اقبالؔ نے جہاں اپنے جذبات کا اظہار لختِ جگر کی حیثیت میں کیا وہاں اُنھوں نے موت ایسے موضوع کو فلسفے کی سطح پر پرکھا اور اُس میں انسان کی بے بسی ،فنائیت ، اُس کے اختیار کو شعری اظہار دیا۔ جبر و قدر ،گریہ زاری،زندگی اور موت کی کڑیاں،ماضی کی بے چین کر دینے والی یادوں کو انسانی زندگی سے وابستہ کیا ہے۔ اقبالؔ کی اِس طویل نظم میں سوز و گداز کی کیفیات ایسی ہیں کہ ہر طرح کی بے حسی پر کاری ضرب لگاتی ہیں اور انسان کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ تحرک کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ اور یہی اقبالؔ کا مطمحِ نظر بھی ہے۔

❁❁❁

ابلیس کی مجلس شوریٰ

یہ عناصر کا پُرانا کھیل ! یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف ونوں
میں نے دِکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب
میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں![۱۷]

اقبالؔ کی یہ نظم اُن کے شعری مجموعے ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے اور مذکورہ اشعار اُن کی کلیات سے لیے گئے ہیں۔ اس نظم کی تخلیق ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔ آٹھ بندوں پر مشتمل یہ نظم بحر، رمل مثمن محذوف میں ہے، جس کے ارکان فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن، فاعلن ہیں۔

یہ وہ عہد تھا، جب یورپ پر قوم پرستی کا جنون بُری طرح مسلط ہو چکا تھا اور یورپ میں ہٹلر ایسا ہیجانی کردار اِس جنونی فلسفے کا ہیرو بن چکا تھا۔ اشتراکی، روس سے باہر پھیل رہے تھے، مسلمان دُنیا بھر میں ذہنی غلامی کا شکار ہو چکے تھے۔ یورپی اور مغربی استعمار کی جکڑیں مضبوط ہو رہی تھیں اور وہاں سے مذہب کی بالادستی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو تقدیر پرستی کی افیون کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ سرمایہ داری کا تسلط آہستہ آہستہ عفریت کی طرح چلتا ہوا، اظہار کی آزادی کو سلب کرنے کی پیش بندی کر رہا تھا۔ یہ سیاسی پس منظر، نظم کی قرأت میں معنویت کی گہری تہ رکھتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیاں باقی تھیں اور دوسری جنگ عظیم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اقبالؔ نے ''ابلیس'' ایسے تمثیلی وعلامتی کردار کے ذریعے اِس آہنی نظام کو چیلنج کیا، اِس نظم کو اس عہد میں رکھ کر دیکھیں تو اِس سے بہتر مزاحمت شاید ہی کہیں دِکھائی دے:

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بُو
کیا زمیں، کیا مہر ومہ، کیا آسمانِ تو بہ تو!
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب وشرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو!
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو[۱۸]

مذکورہ نظم میں ایک اور دلچسپ موازنہ دربار اور پارلیمنٹ کے فرق کا بھی ہے، اِسے بھی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ زورِ کلام، رُعب اور طنطنہ، نظم کے ڈرامائی عناصر میں تناؤ کی کیفیت کو برقرار رکھنے میں مدومعاون ہوتے ہیں۔ تفکر اور حساسیت کا ہیجان معنوی نسبت سے تو وسعت پیدا کرتا ہی ہے لیکن اِس نظم کی جمالیاتی تشکیل بھی ایسی ہے کہ اس کی ماورائی حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، عفریت کی سرکتی ہوئی پیش بنی کس طرح اپنا جلوہ دِکھاتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اِس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟[۱۹]

اگرچہ اُردو میں طویل نظم مثنوی اور قصیدے کی مرہونِ منت ہے اور ہیئتی تجربات کے اثرات اقبال کے ہاں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری نے علامہ اقبال کی طویل نظموں کے بارے میں اپنی مجموعی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے :

> اقبال کی طویل نظموں کو ایک طرح سے اولیت کی فضیلت بھی حاصل ہے۔اس سے پہلے اُردو نظم شاید ہی ایسی فنی پختگی اور فکری گہرائی سے ہم کنار ہوئی ہو۔[۲۰]

اقبال نے اپنے لیے اظہار کے جو شعری معیارات قائم کیے ،اُن کو قائم رکھنا بہ ذاتِ خود کسی معیار سے کم نہیں، اقبال کی طویل نظمیں بُنت کے لحاظ سے قصیدے کے قریب ہیں نیز اُنھوں نے بڑی ہنرمندی سے ان مظاہر کو برتا ہے، ورنہ اِس سے پہلے طویل نظم براہ راست شروع ہو جاتی تھی۔اقبال کی طویل نظموں کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی ساخت اور ترتیب ،اُن کے نظریۂ فن کے تابع ہے،وطن سے والہانہ تعلق،احساس اور فکر کو مربوط کیے ہوئے ہے۔

طویل نظم نے اپنی صنفی حیثیت کو منوانے کے لیے طویل سفر طے کیا،اُسے اپنی منزل پانے میں پانچ صدیاں لگ گئیں۔ اِس طویل جدوجہد میں اُسے مثنوی،قصیدے،شہرآشوب،مرثیہ ،واسوخت ایسے اوصاف کا ساتھ حاصل رہا۔علاوہ بریں منظوم واقعہ نگاری،سیرت نگاری،منظوم تفاسیر،منظوم اسفار وغیرہ کا جزوی تعلق بھی اِس صنف کے خدوخال اُبھارنے میں اِس کا ممدومعاون رہا۔ بعد ازاں طویل نظم کی تخلیقی جست نے اپنے شذرات سمیٹنے کے لیے شعری تخلیقات سے اپنے حصے کے عناصر اکٹھے کیے اور اُنھیں حالی کے حوالے کر دیا جن کی مشاطگی سے شعری امکانات میں بہت سی شروعات کے احسن اقدام کے ساتھ طویل نظم کے لیے بھی یہ مرحلہ نیک فال ثابت ہوا۔حالی نے طویل نظم لکھی تو اُس میں بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی ،یعنی وہ موضوع کو متنوع الجہات اور متنوع الاطراف پھیلانے کی سعی میں سرگرداں رہے، جسے اقبال کے جذبۂ اظہار نے حدت بخشی،اقبال کے ہاں طویل نظم کی پہلی عطا یہی ہے کہ اُنھوں نے موضوع کو امتزاج (variation) دیا اور اُسے چہار جانب پھیلنے کی گنجائش فراہم کی۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۵
۲۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی :اقبال کی طویل نظمیں ،لاہور، گوبل پبلشرز، ۱۹۷۰ء، ص ۴۲
۳۔ ڈاکٹر سلیم اختر: تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید ،لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۳۷
۴۔ ایضاً، ص ۷۴۷
۵۔ علامہ محمد اقبالؔ، کلیاتِ اقبال ، لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۸
۶۔ رخسانہ شاہین رُخی ، اقبالؔ کی طویل اُردو نظموں پرلکھی گئی کتب کا جائزہ، (اقبالیات) مقالہ ایم فِل ،نگران: پروفیسر ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، غیر مطبوعہ، ص ۲۳
۷۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال ، لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۳۔۲۱۴
۸۔ ایضاً، ص ۲۲۱
۹۔ اسلوب احمد انصاری : نقش اقبال ،نئی دہلی : مکتبہ جامعہ، ۲۰۱۲ء، ص ۸۶
۱۰۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال ، لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۴۲۳۔۴۲۴
۱۱۔ عمیق حنفی، اقبال کی مسجد قرطبہ، مشمولہ مسجد قرطبہ ، مرتبہ، ڈاکٹر خالد ندیم، راولپنڈی، الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۸۷
۱۲۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال ، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۴۲۷۔۴۲۸
۱۳۔ کلیم الدین احمد: ''مسجد قرطبہ''، مشمولہ مسجد قرطبہ مرتبہ، ڈاکٹر خالد ندیم، راولپنڈی: وی پرنٹ بک پبلشنگ، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۷
۱۴۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال ، لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۶
۱۵۔ اسلوب احمد انصاری، اقبال کی تیرہ نظمیں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۵۱
۱۶۔ علامہ محمد اقبالؔ: کلیاتِ اقبال ، لاہور: اقبال اکادمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۶۰
۱۷۔ ایضاً، ص ۷۰۱
۱۸۔ ایضاً، ص ۷۰۸
۱۹۔ ایضاً، ص ۷۱۱
۲۰۔ ڈاکٹر اسلم انصاری: ''مسجد قرطبہ :فکری اور فنی مطالعہ''، مشمولہ مسجد قرطبہ، مرتبہ، ڈاکٹر خالد ندیم، راولپنڈی: الفتح پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۷